اسلامی فلسفۂ حیات اور عالمی تناظر میں تحمل مزاجی کی اہمیت

مولانا کرامت اللہ☆

Abstract:

The qualities and properties which are predicable of human essenc(Zat),as the general merits and demerits by which a man is evaluated, among them the moral or ethical qualities have their distinct and specific status and degree,being enunciated by religion and espoused by pure discretion and pious intuition.They are naturally classified as good or praiseworthy qualities,and bad or blameworthy qualities.Then,each quality is either "intransitive",that is related to personal and individual life,or "transitive",that is related to collective and social life;or both intransitive and transitive.In good and commendable qualities,there is one which is termed as"Tolerance",which shortly means to endure and put up with the troubles that are inflicted by other beings.Here is some reflection on the importance and excellence of this great communal virtue(that is in fact what can not be overestimated),as with reference to the Islamic instructions and the current world perspective.

اسلامی فلسفۂ حیات اور عالمی تناظر میں تحمل مزاجی کی اہمیت

مولانا کرامت اللہ

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان کو جہاں ماہیت اور ساخت وصورت میں دوسری مخلوقات سے بہت مختلف پیدا کیا ہے، وہاں مقصد وغایت اور بنیادی مالہ وما علیہ کے اعتبار سے بھی اسے نہایت ممتاز ومنفرد حیثیت سے نوازا ہے۔ دین ومذہب کے لحاظ سے انسان فی الواقع ایک روحانی ہستی ہے جس کا حقیقی ٹھکانہ ماوراء الظاہر (meta-cosmic) یعنی عالمِ آخرت قرار پایا ہے جو لامتناہی امکانات اور خداوندِ قدوس کی قدرت وحکمت وغیرہ کی اصل جلوہ گاہ ہے، اور یہ دنیا اگر اس کے لئے مقصود ہے تو اسی آخرت کے اعتبار سے مقصود ہے: خلقت الدنیا لکم وخلقتم للاخرة (دنیا تمہارے لئے اور تم آخرت کیلئے پیدا کئے گئے ہو)۔ تو دنیا بے شک انسان کے لئے ہے اور اس سے متعلق امور سے اس کا ضرور واسطہ ہے، مگر بنیادی طور محض اسی اُخروی غرض کی خاطر ہے۔ انسانی وجود کا بس یہی پہلو ہے جو دیگر جملہ جہات پر اس طرح غالب وحادی ہے کہ اس بابت کسی بھی حوالے سے گفتگو کرنی ہو تو محور ومرجع اسی کو قرار دینا پڑتا ہے۔

انسان کو نہ آزاد پیدا کیا گیا اور نہ اپنی مرضی پر اسے چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ دیکھا جائے تو اس کے سامنے سوائے مسائل و مشاکل کے اور کچھ نہیں۔ ان مسائل کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: حالی (Immediate) اور مآلی (Ultimate)۔ حالی یا فوری مسائل سے مراد اس دنیوی زندگی کے مسائل ہیں جن کی تعبیر اختصاراً روٹی، کپڑے اور مکان والے مسائل سے کی جاتی ہے، اور انسان کی جو انفرادی سعی اور کدوکاوش نظر آتی ہے اور اجتماعی پروگراموں اور مختلف ادارات وتنظیمات وغیرہ کا جو سلسلہ ہوتا ہے وہ انہی کے سبب ہوتا ہے۔ جبکہ مآلی یا نہائی مسائل وہ ہیں (خواہ انسان کو ان کا مطلوبہ ادراک وشعور اور ان سے نمٹنے کی ضرورت کا احساس ہو یا نہ ہو) جو اس کے وجود کے اس دور سے متعلق ہیں جو مذکورہ اخروی اور دائمی وابدی مرحلہ ہے۔ ہمیں کہاں جانا ہے؟ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ موت کے بعد کس قدر مختلف صورت حال کا سامنا کرنا ہے؟ قبر، حشر نشر اور حساب کتاب وغیرہ مراحل آخر کیسے طے ہوں گے؟ اللہ کو کیوں اور کیسے راضی رکھا جائے؟ یہ انہی مسائل والے سوالات ہیں۔ جیسے اس نوع کے فلسفیانہ وفکری اور وجدانی سوالات کہ اس کائنات سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ اس میں ہمارا کیا مقام ہے؟ اور جس مقام کو ہم اس میں رکھتے ہیں اس کے لئے کس قسم کا رویہ اور طرزِ عمل مناسب اور درکار ہے؟ (۱)

دینِ خداوندی جس کی سب سے آخری اور مستند ترین شکل اسلام کی صورت میں سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ظہور پذیر ہوئی، اس میں ان مآلی یا اخروی مسائل کو نہایت توضیح وتنقیح اور بہت معقول ومنظم طور سامنے لا کر انسان سے اپنی تمام تر عقلی، نفسیاتی اور جسمانی قوتوں کو اصلاً واولاً ان ہی کے لئے وقف کر رکھنے کا مطالبہ ہے، کہ جس کا واحد طریقہ خدا کے ان احکام کی بجا آوری وپاسداری ہے جس کا انسان کو مکلّف بنا کر انہی کے تحت زندگی بسر کرنے کا پابند ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ دنیا

میں انسان سے مطلوب اللہ تعالیٰ کی یہی اطاعت و بندگی ہے جو دراصل وہ امتحان و آزمائش ہے جس کا نتیجہ آخرت کی فلاح و سعادت یعنی جنت، اور یا وہاں کے خسران و شقاوت یعنی دوزخ کی شکل میں نکلنا ہے: جبکہ یہی اُخروی کامیابی اور اُخروی ناکامی ہی اصل میں کامیابی اور ناکامی قرار دی گئی ہے: ''پس جو شخص دوزخ کی آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو وہ کامیاب ہو گیا''۔(۲)

اب بات یہ ہے کہ اس دین برحق کے جو مختلف و متنوع قوانین و ضوابط اور تکلیفی و تشریعی امور ہیں بلاشبہ وہ مذکورہ اخروی مقصد کیلئے تو ہیں ہی، ان کے انفرادی و اجتماعی اہتمام والتزام کی بدولت دنیا میں بھی ایک ایسی فضاء میسر آسکتی ہے جو دنیاداری اور عیش کوشی و شہوت پرستی کے دلدادہ بے ایمان و بے ضمیر افراد کے معیار و اعتبار سے قطع نظر، جذبہ خدا طلبی سے مالا مال اور روحانیت وللّٰہیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے پاکیزہ اور نیک سرشت بندگانِ خدا کے نزدیک ایک مایۂ بے بہا ثابت ہوسکتی ہے: جس کے تحت پھر کیا بات محبت والفت کی! کیا بات ہمدردی کی! کیا بات باہمی تراحم اور تعاون و تناصر کی! غرضیکہ انسانی طبیعت اور عقلِ سلیم کی اس انداز والی اخلاقی و روحانی ضرورتوں اور چاہتوں کا کوئی بھی پہلو اس کی تعلیمات و ہدایات کے دائرے سے خارج نہیں رہتا۔ جیسا کہ اس دین حق سے مطلوبہ قربت ولگاؤ اور اس کی مقصدیت و معنویت سے آگاہی رکھنے والے افراد بخوبی جانتے ہیں کہ مطالبۂ اخروی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس دنیوی زندگی کی فلاح و بہبود کا بھی صحیح معنی میں صرف یہی دین ضامن و متکفل ہے۔ چنانچہ دین کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وضع الٰھی سائق للبشر الیٰ ما ھو خیر له فی الدارین

یعنی ایک الٰہی دستور جو انسان کو دونوں جہانوں کی بھلائی کی طرف لے جانے والا ہو:

جیسے کہ اس طرح بھی اس کی تعریف بیان کی گی ہے:

قانون سماوی سائق لذوی العقول الی الخیرات بالذات

(ایک آسمانی قانون جو اہلِ عقول کو ان امور کی طرف لے جانے والا ہو جو بالذات بھلائیاں ہوں)۔(۳)

اس بناء پر بلاخوف کہا جا سکتا ہے کہ دینِ اسلام کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا لازمہ ٹھہرا کر اس کی کما حقہ پاسداری کو اگر واحد وظیفہ بنالیا جائے، تو آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ضرور مثبت نتیجہ اور موافق اثر مرتب ہوسکتا ہے۔ جیسے اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جاسکتا کہ کسی ملک میں شرعی قوانین اور اسلامی طرز حکمرانی رائج ہو تو تقریباً وہ جملہ مسائل حل یا کم ہوسکتے ہیں جو حکومتی دائرہ کار میں آتے ہیں۔ یہ پھر الگ بات ہے کہ ایک کم ظرف اور دینی لحاظ سے کور چشم نے پاکستان کے حوالے سے کہا تھا کہ اہلِ وطن کو اسلامی نظام کی نہیں، روٹی، کپڑے اور مکان وغیرہ کی ضرورت ہے۔ بخدا یہ تو بعینہ ایسا ہے کہ کہا جائے کہ مریض کو علاج کی نہیں گولی، شربت اور ٹیکے وغیرہ کی ضرورت ہے۔

اس لحاظ و جہت سے اسلام حقائق اور واقعیات کا دین ہے نہ کہ فرضیات و توہمات کا۔ اس میں دوسرے ابنائے نوع کی نسبت جو احکام و ہدایات ہیں کہ جنہیں ''حقوق العباد'' کے جامع نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان میں بنیادی فلسفہ و مصلحت ہی یہ کارفرما ہے

کہ واقعی اور زمینی حاجات ومشکلات میں ایک آدمی کیونکر دوسرے کے کام آسکتا ہے؟ ایک کا وجود کس طرح دوسرے کیلئے منبعِ خیر وخوبی ثابت ہوسکتا ہے؟ کیسے ایک فرد کے شر وفساد اور منفی سرگرمیوں سے دوسرا محفوظ رہ سکتا ہے؟ اور کیسے دوسرے کی بُرائی پر صبر اور نیکی پر شکر ادا کرنے کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے؟ تو اسلامی تعلیمات وارشادات میں دنیوی حوالے سے بنیادی چیز بس یہی باہمی بھلائی اور خیر رسانی ہے جس سے ظاہر ہے کہ مقصود ایک ایسے معاشرے اور سماج کا قیام ہے جہاں اس مدنی الطبع مخلوق (social being) کے لئے ظلم و اذیت سے خالی ایک ایسا ماحول فراہم ہو جو ''بہشت آنجا کہ آزادے نباشد'' ہی کا مصداق ثابت ہو۔ پھر اس تناظر میں یہ بات بسہولت فہم وعقل میں آتی ہے کہ اجتماعی بلکہ بین المللی زندگی میں انسانی اعمال اور اخلاق واطوار کا کون سا جزء اور پہلو کیوں کر اور کس حیثیت وکیفیت سے کارآمد ومطلوب ہے اور اس پر اثر انداز ہونے والے اندرونی وبیرونی اسباب وعوامل اور ان کی کارکردگی وکارآمدی کی تعیین کس طرح ہوگی؟ جیسے ان اخلاق واطوار میں سے ایک ''تحمل مزاجی'' ہے جو یہاں زیر بحث ہے:

تحمل مزاجی (tolerance) کا خلاصہ اور حاصل ہے ''دوسروں کی بُرائیوں اور خلاف طبع باتوں کو برداشت کرنے اور ان پر منفی ردعمل ظاہر نہ کرنے کا رویہ وعادت''۔

دین اسلام ایک کل (whole) کی حیثیت میں ہے جس کے لازمی اجزاء (integral parts) کے طور پر مختلف شعبے ہیں: عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات، معاشرات۔ ان سب شعبوں کے اپنے اپنے احکام ولوازم ہیں کہ جن سب پر عمل کرنے کا حکم اور تاکید ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ادخلوا في السلم كافة (اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ)۔ (۴) ان جملہ کلیات و جزئیات کی عملی رعایت رکھنا ہی دینداری کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس قاعدہ کے تحت بہت سارے افراد مومن اور مسلمان تو بیشک ہوسکتے ہیں اور ہیں مگر دیندار لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تحمل مزاجی کا تعلق ان شعبوں میں ظاہر ہے کہ شعبۂ اخلاق سے ہے، جبکہ معاملات اور معاشرات سے اس کا گہرا تعلق اور وہی اس کے لئے اصل میدانِ عمل وانطباق ہیں۔

اس حقیقت میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں کہ ''تحمل مزاجی'' علی الاطلاق اور بنیادی طور پر ایک وصفِ محمود اور خُلقِ محبوب ہے اور اسلام جس کی خاصیت ہی دوسروں کے لئے عافیت وسلامتی اور ایثار وقربانی کی فضا مہیا کرنا ہے، اس میں کیوں اسے وہ مخصوص وممتاز درجہ عنایت نہ کیا گیا ہوگا جو اس کا حقِ لازم ہے۔ چنانچہ اسلام میں جس طرح دوسرے لوگوں کو اپنی دل آزاری اور زبان وہاتھ کی اذیت رسانی سے محفوظ رکھنا نہایت اہم اور مسلمان ہونے کی نشانی و دلیل قرار دیا گیا ہے، اسی طرح دوسروں کی تکالیف اور زیادتیوں کو برداشت کرنے کی بھی ازحد اہمیت وفضیلت بتلائی گئی ہے۔

ویسے تو عموماً ہر قسم کے حالات میں صبر وتحمل کا شیوہ اپنائے رکھنے کا بہت تاکید وتشدید کے ساتھ درس دیا گیا ہے، مگر خصوصی طور جب دوسرے ابنائے جنس کی طرف سے ناخوشگوار احوال یا ان سے کسی بناء پر اختلاف وشقاق کی نوبت پیش آرہی ہو تو وہاں تو بہ درجۂ اتم اس امر کی ضرورت واہمیت کی پاسداری مطلوب ہے کہ کسی طرح بھی صبر وبرداشت کی رسی ڈھیلی نہ ہونے پائے۔ دشمن کے ساتھ بھی جو انصاف واعتدال کا سلوک کرنے کا حکم ہے وہ دراصل اسی تحمل مزاجی کا مظہر اور اسی کی اہمیت وضرورت کی تلقین ہے: جیسا

کہ قرآن پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ ''کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو''۔(۵) اس آیت سے قبل اسی قسم کی آیت کے تحت علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ ماہِ ذیقعدہ میں محض عمرہ ادا کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی وظیفہ کی بجا آوری سے روک دیا۔ نہ حالتِ احرام کا خیال کیا، نہ کعبہ کی حُرمت کا، نہ محترم مہینہ کا، نہ ہدی وقلائد کا۔ مسلمان شعائر اللہ کی اس توہین اور مذہبی فرائض سے روک دیئے جانے پر ایسی ظالم اور وحشی قوم کے مقابلہ پر جس قدر بھی غیظ وغضب اور بغض وعداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے، اور جوشِ انتقام سے برافروختہ ہو کر جو کارروائی بھی کر بیٹھتے وہ ممکن تھی۔ لیکن اسلام کی محبت اور عداوت دونوں جچی تلی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے جابر وظالم دشمن کے مقابلہ پر بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔ عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں حد سے گذر جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہو کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور عدل وانصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو''۔(۶)

اس لحاظ سے لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی زیادتیوں کو سہنے والے شخص کو بہتر گردانا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو مسلمان لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو ان سے میل جول نہیں رکھتا اور ان کی اذیتوں پر صبر نہیں کرتا''۔(۷)

مختلف احادیث مبارکہ سے تحمل مزاجی کی اہمیت وفضیلت واضح ہوتی ہے:

ایک روایت کا مفہوم ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کچھ برا بھلا کہہ رہا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس شخص کو جواب دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز مبارک وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ بعد میں آپ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ جس وقت تم خاموش تھے ایک فرشتہ تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا: پھر جب تم جواب دینے لگے وہ فرشتہ رک گیا۔(۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ ''کسی بندے نے ایسا کوئی گھونٹ نہیں پیا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے بہتر ہو جس کو آدمی پی لے''۔(۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے پروردگار تیرے بندوں میں تیرے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ شخص کہ ''جب وہ قادر ہو جائے تو معاف کر دے''۔(۱۰)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے غصے کو روک لیا حالانکہ وہ اسے جاری کر سکتا تھا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں کے سامنے بلا کر اُسے اختیار دیدے گا کہ جس حور کو چاہے لے لے''۔(۱۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''زور آور وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ سکے:

زور آور وہی ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو پالے"۔(۱۲) جبکہ غصہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ "غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلوہ شہد کو خراب کرتا ہے"۔(۱۳)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "لوگوں کی چال چلنے والے مت بنو، کہ ایسا کہو کہ اگر لوگوں نے احسان کیا تو ہم احسان کریں گے اور اگر انہوں نے ظلم کیا تو ہم بھی ظلم کریں گے؛ بلکہ اپنے آپ کو اس پر جمائے رکھو کہ اگر لوگ تمہارے ساتھ احسان کریں گے تو تم بھی احسان کرو گے اور اگر وہ بُرائی کریں گے تو تم ظلم نہیں کرو گے"۔(۱۴)

اسی طرح کسی بات پر کسی کے ساتھ اختلاف یا جھگڑا ہو جائے تو متعین حد سے زیادہ اس سے ترکِ تعلق جائز نہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے"۔(۱۵) ایک روایت میں اس طرح ہے کہ "کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑ دے، کہ جب دونوں آپس میں ملیں تو یہ بھی منہ پھیر رہا ہو، اور وہ بھی منہ پھیر رہا ہو، اور ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے"۔(۱۶)

اسی طرح تحمل مزاجی کے علاوہ عمومی طور جو حُسنِ خُلق یا خوش اخلاقی کا رویہ ہے، اس کی جتنی بھی اہمیت ذکر کی جائے کم ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ارشاد مروی ہے کہ میرے نزدیک تمہارے بہترین لوگوں میں سے وہ ہیں جو تم میں سب سے اچھے اخلاق والے ہوں۔(۱۷) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن مومن کی ترازو میں خوش خلقی سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، اور بیشک اللہ تعالیٰ فحش گو اور بدزبان کو ناپسند کرتا ہے۔(۱۸)

بُرائی کے بدلے میں اچھائی دکھانا نہایت ہمت وعزیمت اور عالی ظرفی کی صفت ہے جو ہر کسی کو عنایت نہیں کی جاتی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بُرائی کے بدلے میں اچھائی کا سلوک کرنے اور اس کی اہمیت کے متعلق ہدایت فرمائی ہے، وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ خصلت صرف ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو صبر و تحمل والے اور بنیادی طور بہت زیادہ خوش قسمت واقع ہوں، چنانچہ ارشاد ہے:

> "نیک برتاؤ سے (لوگوں کی برائی کو) دفع کیا کرو پھر یکایک تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو صبر و تحمل والا ہے اور اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب قسمت ہے"۔(۱۹)

اس آیت کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ "صبر و تحمل غضب کے وقت ہوتا ہے اور معافی (کسی کی طرف سے) برائی پہنچنے کے وقت ہوتی ہے۔ اگر لوگ اس طرح کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور ان کے دشمن کو ان کے سامنے مطیع کر دے گا گویا کہ وہ دلی دوست ہے"۔(۲۰)

کسی کے ظلم و زیادتی کو برداشت کر کے اس کا انتقام نہ لینا قرآن میں اولوالعزمی اور بلند ہمتی قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے، یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے"۔(۲۱)

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جس بندہ پر ظلم ہوا اور اس نے محض اللہ کے واسطے اس سے درگذر کیا تو ضرور اللہ اس کی عزت بڑھائے گا اور مدد کرے گا۔

اس طرح اسلامی مآخذ کے ضروری ادراک سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تحمل مزاجی یا صبر و برداشت کو کیا مقام و مرتبہ حاصل ہے اور اسے اختیار کرنے اور ہمہ وقت اس سے آراستہ رہنے کی کس قدر تاکید و ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ اسلامی فکر کی پاسداری کرتے ہوئے اور ساتھ عقلی و وجدانی وغیرہ عوامل کو دیکھ کر اس بہترین خصلت کو حرز جان کی حد تک عادت و شیوہ بنا کر شاہراہ حیات کے ہر موڑ پر اس کو عمل میں لانے کے سوا چارہ نہیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کل مسلمانوں میں دیگر اچھی خوبیوں کی طرح تحمل مزاجی بھی مفقود ہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر شدید ردعمل ظاہر کر کے معاملہ بہت پیچیدہ اور پریشان کن حد تک پہنچانے کی نوبت دکھائی جاتی ہے، گویا دورِ جاہلیت کی یاد تازہ کی جارہی ہو جب صورتحال ایسی ہوا کرتی تھی کہ ۔

کبھی پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کبھی گھوڑا آگے دوڑانے پہ جھگڑا

تحمل مزاجی کی یہ بہترین صفت جو اس طرح ناپید ہے، تو گھروں، بازاروں، مختلف محفلوں اور اداروں میں جس طرح کی کیفیت رہتی ہے اگر وہ نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا؟

اس میں بھی شک نہیں کہ ہر قسم کی مصیبت و آفت پر صبر کرنا اور خصوصاً انسانوں کی ایذا رسانیوں اور غلط کارکردگیوں کو گوارا کرنا یقیناً بہت مشکل اور بڑے دل و گردے کا کام ہے، مگر اسی لئے تو اس میں اجر و ثواب بھی غیر معمولی طور زیادہ ہے، چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے کہ ''صابرین کو ان کا اجر بلا حساب دیا جائے گا''۔ (۲۲)

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''صبر کا بدلہ اللہ کے نزدیک جنت کے سوا کوئی نہیں''، جیسا کہ ایک جگہ آپ سے مروی ہے کہ ''قیامت کے روز جس وقت کہ مصیبت والوں کو اجر و ثواب دیا جارہا ہوگا، خیر و عافیت والے لوگ یہ آرزو کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کی جلدیں قینچیوں سے کاٹ دی جاتیں''۔ (۲۳)

مشہور مقولہ ہے کہ العطایا بقدر البلایا یعنی بخشش و انعامات ابتلاءات و آزمائش کے بقدر ہوا کرتے ہیں۔ جیسے عام قاعدہ یہ بھی ہے کہ ."No pain,no gain" (بغیر درد اُٹھائے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا)۔ چنانچہ جس قدر آلام و مصائب اور ان کا صبر و برداشت زیادہ ہوگا، اسی قدر آخرت میں بدلہ اچھا ملے گا، کہ جس سے محروی انتہائی عظیم محرومی اور حقیقت میں یہی بہت مشکل عمل ہے، بقول شاعر ۔

الصبر فی النائبات صعب　　　لکن فوت الثواب اصعب

(مشکلات میں صبر کرنا بہت دشوار ہے، لیکن ثواب کا فوت ہونا اور زیادہ دشوار ہے)

مولانا رومی نے بجا فرمایا ہے:

صد ہزاراں کیمیا حق آفرید کیمیائے ہمچو صبر آدم ندید

(حق تعالیٰ نے لاکھوں کیمیا پیدا کیے ہیں مگر صبر جیسا کیمیا بنی آدم نے نہیں دیکھا)

اس کے ساتھ عقائدی میدان (dogmatic field) کے بہت بنیادی ارٹیکل عقیدۂ قضاوقدر کی جو حقیقت ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی وجود پذیر ہوتا ہے، بشمولِ افعال انسانی، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے مقرر و مقدر شدہ (pre determined) اور اسی کی تخلیق و تکوین سے ہوتا ہے، پس اسلامی ہدایت کے تحت اس کے اس پہلو کو اگر سامنے رکھا جائے جس کے مطابق جو کچھ بھی ہو جائے، مصیبت و کلفت والی کوئی بات پیش آ جائے تو اس کو تقدیر یعنی خدا کے سپرد کر کے صبر اختیار کر لیا جائے، تو اس سے بھی تسلی و اطمینان کی ایک متاعِ بے بہا ہاتھ آ سکتی ہے۔ چنانچہ (حتی الامکان حزم و احتیاط اور مطلوبہ تدابیر کے بعد بھی) کسی کی طرف سے مالی، جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی وغیرہ کوئی ضرر و نقصان پہنچے تو بجائے غیر ضروری ردعمل ظاہر کرنے کے اسے دستِ تقدیر کی کارفرمائی اور اللہ تعالیٰ کے اٹل فیصلے اور ازلی مشیت و حکمت کا نتیجہ سمجھ کر برداشت کی چادر اوڑھ لی جائے۔ مولائے روم فرماتے ہیں:

ہیچ بغضے نیست در جانم زتو زانکہ ایں را من نمیدانم زتو

(میرے دل میں تیرے لئے کوئی بغض و عداوت نہیں، اس لئے کہ (تیری طرف سے پہنچی ہوئی) اس تکلیف کو میں تیری طرف سے نہیں سمجھتا)۔

اسی طرح تحمل مزاجی پیدا کرنے کے لئے تمام لذتوں کو توڑنے والی چیز ''موت'' کا استحضار ضروری ہے، کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت انسان کو نہ مال و دولت کی تمنا ہوگی اور نہ عزت و منصب اور طاقت و شوکت کی، اگر کوئی آرزو اور حسرت ہوگی تو تحمل مزاجی جیسی عظیم نعمت اور موت کے بعد کام آنے والی دیگر صفات و عادات اور اعمالِ حسنہ ہی کی آرزو اور حسرت ہوگی۔ جبکہ موت تو ایسی چیز ہے کہ جس کے سامنے ہر عقل و منطق فیل ہو جاتی ہے، ہر فلسفہ جواب دے دیتا ہے اور ہر فتح شکست میں بدل جاتی ہے۔ موت یقیناً بہت دہشت ناک حقیقت ہے۔ ایک نان مسلم تک کو کہنا پڑا ہے:

"Whether it comes sooner or later, the prospect of death and threat of non being is a terrible horror."

(خواہ جلد آئے یا بدیر، موت کی توقع اور عدمِ وجود کی دھمکی ایک خطرناک دہشت ہے)

اب یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ تحمل مزاجی تو جیسی ہے ویسی ہے، تاہم تحمل مزاجی کی ایک حد بھی ضرور ہے اور ہونی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تحمل مزاجی کی یہ عمدہ اور مطلوب و مندوب خصلت کہیں اس چیز میں تبدیل ہو جائے جس کی تعبیر و تفسیر کے لئے کتبِ لغت میں اور ہی قسم کے الفاظ موضوع ہیں۔ یہ مثلاً ایسی حالت ہوگی جب تحمل مزاجی کی اس متعارف خوبی سے دست کشی کرنا

ظلم وتشدد نہیں بلکہ کسی اور مقدس نام سے پکارے جانے کی نوبت ہوگی۔ یہ بلاشبہ ایسی صورت حال ہوگی جہاں کسی عارض کی بناء پر مطلوبہ استعمال واطلاق میں تغیر والا معاملہ ناگزیر ہوگا، کہ جسے بہر حال مصداق اور پروسیجر کی تعیین ہی کے ایشو کے طور پر لینا ہوگا۔ یعنی مسئلہ تحقیق اور تشخیص وتنقیح کا ہے کہ کب وہ موقع ہے کہ تحمل مزاجی کا استعمال یا عدم استعمال اپنے محل پر ہے یا وہ غلط اور بے جا ہے۔ مطلب یہ کہ تحمل مزاجی فی الواقع اور intrincically ایک اچھی صفت اور اسلام کی ہدایت اور حکم ہے، تاہم کسی امر عارض (external factor) کی وجہ سے اگر اس کو چھوڑ کر برعکس کچھ کرنا پڑے تو وہ اپنی جگہ جائز اور لازم ہوگا، مگر وہ بھی اصل میں اسلام ہی کی تعلیم اور اسی کے تقاضے کی پاسداری والی بات ہوگی۔ مثلاً کسی ظلم کو ختم یا کم کرنے کے لئے کوئی درست اور معقول طریقہ اور حکمت عملی اختیار کرنا ممکن ہو کہ جس کا اُلٹا کوئی نقصان اور ضمنی اثر نہ ہو، تو اس کو ضرور اختیار کرنا چاہئے۔ نہ کہ ایسی صورت میں بھی تحمل مزاجی کے نام سے خود بھی ظلم وستم برداشت کرتے رہا جائے اور دوسرں کو بھی برداشت کرنے دیا جائے۔

آج کل عالمی طور پر جو فضاء بنتی جارہی ہے اور اسلام اور اہل اسلام کو جو ایک خاص نظر سے دیکھا جارہا ہے اس کے تحت غور و فکر کے لئے کئی طرح کے زوایئے مل سکتے ہیں۔ منجملہ ان میں سے یہ ہے کہ دینِ اسلام اور اس کے حاملین کے متعلق جو غیر مسلم اقوام یا مغرب والوں کا رویہ ہے جو ایک قسم کی نفرت اور کراہت کا آئینہ دار ہے، آخر اس کا منشا اور بنیادی سبب و باعث کیا چیز ہے؟ آیا وہ مسلمانوں کی طرف سے پہنچنے والے حقیقی یا وہمی خطرات ومشکلات کی بناء پر ہے یا محض کسی ایسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے جو انسانی زندگی کے ایک بہت بڑے المیے کے طور پر ہر جگہ موثر ثابت ہو کر ضرور ایسی کارستانی وکھانے میں کامیاب ٹھہرتی ہے کہ جس کے بارے میں پشتو کا یہ شعر ہی سب سے موزون ومناسب ہے:

غضب خو دا قیامت خو دا دے کنه
چې هم وژنې هم م نه پیژنې

(یعنی غضب اور قیامت تو یہی ہے کہ تو مجھے قتل بھی کر رہا ہے اور مجھے پہچانتا بھی نہیں ہے)

یا بہ الفاظ دیگر جو غیر لوگ ہیں آیا وہ اسلام سے من حیث الاسلام، اس کی اصل روح و جوہر اور صورت و ہیئت کا ادراک و استحضاء رکھ کر ہی متنفر و مجتنب ہیں، یا اسلام کی طرف منسوب اور اس کا حوالہ دے کر ادا کی جانے والی بعض چیزیں ان کی نفرت وعداوت کی بنیاد ہیں؟ یعنی کیا وہ حقیقی واصلی اسلام اور اس کی تعلیمات اور کلیات و جزئیات کے مخالف اور دشمن ہیں یا وہ چیزیں ان کے لئے مذموم و مبغوض ہیں جو مسلمانوں کا شب و روز کا شیوہ اور اوڑھنا بچھونا ہونے کی وجہ سے گویا اسلام ہی کی تعلیمات اور اسی کے لوازم و ضوابط معلوم ہوتی ہیں؟ جبکہ نفس الامر اور حقیقت میں ان کا اسلامی احکام اور نبوی ہدایات سے بہت دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ الٹا ان کی مخالفت اور ضد والی باتیں ہیں۔

اس ضمن میں کچھ اس طرف بھی اشارہ مناسب ہے کہ کیسی ہی سازش تھی یا کیا ہی اتفاق تھا کہ نائن الیون کے ایک منفرد

واقعے نے پوری دنیا میں ہلچل مچادی اور انسانی دنیا کے رائج نقشے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ بہر حال درست ہو یا نہ ہو یہ تجزیہ اب تقریباً اتفاقی بن گیا ہے کہ یہ واقعہ کرہ ارض پر بسنے والے مسلمانوں کے خلاف منفی سوچ پیدا کرنے کے لئے ایک سازشی منصوبہ تھا جس کے لئے مخالف قوتوں کو خود بڑی قربانی دینی پڑی۔ اس حادثے کے بعد پیدا ہونے والے انتشار اور تناؤ نے یقیناً مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک خاص پوزیشن پر لا کھڑا کیا اور ساتھ ساتھ ایک خاص لابی نے بین الاقوامی میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے ایسے تبصرے کئے اور اصطلاحات وضع کر دیں جو اس سازشی عمل میں کارآمد ٹھہریں۔ مخالفین نے مسلمانوں کی بدنامی اور رسوائی کیلئے ایسی رپورٹیں تیار کیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مسلمانوں کو تند مزاجی اور بے تحملی پر مجبور کرنے کیلئے طرح طرح کے ٹوٹکے استعمال کئے گئے تا کہ اہلِ اسلام کا کم از کم ایک فریق ایسا سامنے آسکے جو مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی جارحیت آور الائنس کے لئے بہانہ بن سکے۔

چنانچہ تحمل مزاجی جہاں لذاتہ ایک خوبی ہی خوبی ہے، وہاں اس کی ضرورت و اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب متعلقہ حالات ایسے نازک موڑ پر پہنچ جائیں جب لمحہ بھر کی بے احتیاطی یا بے صبری کی سزا سالوں پر محیط ہو سکتی ہے، اور خود مسلمانوں ہی کے لئے ایسی فضا نمودار ہو سکتی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ محض دنیوی طور پر ان کا نصیب سوائے حسرت و فریاد اور کچھ نہ رہے بلکہ دینی و اخروی لحاظ سے بھی ان کے حق میں کوئی اچھا شگون سامنے آنے والا نہ ہو۔

آج کل جو پوزیشن اور ماحول ہے کیا یہ بات محتاج بیان ہے کہ کون سا قدم کہاں رکھے جانے کا اقتضاء کرتا ہے۔ کیا نہایت فکر و تدبر اور بہت زیادہ حکمت و مصلحت سے مالا مال رہنے کی ضرورت نہیں؟ تو کیا ایسے میں کسی بھی حوالے سے دعوت بس یہی سامنے نہیں آتی کہ نہایت مضبوطی و سنجیدگی سے جہاں دیگر احکامِ دین کی بجا آوری کے سوا کوئی صورت نہیں، وہاں خدا کے لئے اس اہم حکم تحمل مزاجی سے نہایت اونچی سطح پر کام لینے کی پابندی کو یقینی بنایا جائے؟

چشمِ فلک دیکھ رہی ہے، دشت و دریا گواہ ہیں کہ وہ کون سی چیز اور طرز و انداز ہے جس کے سبب مسلمان غیر ضروری اور بلا مقصد مار کھا رہے ہیں۔ آیا وہ کیا کچھ ہے اور کون سا طریقہ و فارمولہ ہے جسے اپنا کر وہ عبث اور فضول تباہی و بربادی سے بچ سکتے ہیں۔ کیا جس تحمل و برداشت سے ایک طرف اسلامی تقاضا بھی پورا ہو سکتا ہے اور دوسری طرف لاحاصل الجھن اور خود ساختہ مصیبت کی بھی روک تھام ہو سکتی ہے، اس سے احتراز برتنے کا آخر کیا باعث و داعیہ ہے؟ اس سے زیادہ مناسب و موزون اور بہتر موقع اور کون سا آسکتا ہے؟

آخر میں یہ عرض کرنا مقتضائے حال سمجھتا ہوں کہ آج کل مسلمانوں کے لئے تحمل مزاجی کا معاملہ کتنا اہم ہے، یہ سوال اپنی جگہ صحیح، مگر جو اصل اہمیت کا حامل اور نہایت فکر و توجہ والا مسئلہ ان کی بابت درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آخر یہ مسلمان کہلانے والے لوگ خدا کی طرف سے آئی ہوئی تعلیمات و ہدایات سے اس قدر بیزار اور کنارہ کش کیوں ہیں؟ وہ خود ہی اسلام کے احکام کے اتنے برعکس کیوں چل رہے ہیں؟ غیر مسلموں کی اسلام سے نفرت و دوری تو اپنی جگہ مسلّم ہے ہی، مگر ان مسلمانوں کے طرز عمل اور دن رات کے انہماکات اور چال چلن سے یہ کیوں واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ ان کی بھی اصل مخالفت و مخاصمت بس اسلام اور دینی احکام ہی سے ہے۔ یہ حقیقت کسی طرح بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت کم ہی مسلمان اسلام پر صحیح طور پر عمل پیرا ہوں

گے، باقی کو اسلام یاد تک بھی نہ ہوگا۔ تقویٰ و پرہیزگاری نام کی چیز جو اسلام کی اصل روح ہے، ان کی مصروفیات وترجیحات سے کوسوں دور ہے۔ بس وہی کچھ ہم مسلمان بھی کر رہے ہیں جو غیر مسلم کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ سارے معیارات اور رجحانات و میلانات تقریباً ایک ہی ہیں۔ موت، حشر ونشر، حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کے ہولناک اور سنگین مراحل سے وہ بھی سارے غافل اور بالکل بے خوف ہیں اور عملاً ہم بھی۔

تو مسئلہ دراصل مسلمان بننے یعنی دیندار ہو کر رہنے کا ہے کہ دین کے جتنے بھی شعبے ہیں، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور معاشرات، جیسا کہ ذکر کیا گیا تھا، ان سب کے سب کی عملی پاسداری کی جائے۔ تو جب یہ دینداری والی سوسائٹی قائم ہوگی تو خود بخود جس چیز کی جہاں ضرورت ہوگی وہ ہوتی جائے گی۔ جہاں مثلاً شعبۂ اخلاق سے متعلق حکم ''تحمل مزاجی'' درکار ہوگی تو اس سے ذرہ برابر بھی اعراض نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح ہر ہر عمل اور حکم کی بجا آوری کی نوبت ہوگی، اور اس کے متعلق جملہ کیفیات و لوازم اور اس کے مضمرات واثرات سے خود بخود خبر گیری کا دور دورہ ہوگا۔

تو یہ دنیا ہے اس میں سب سے پہلے نمبر پر حضرت انسان کو اپنے مقصد حیات اور نظریہ حیات کی تعیین کرنی ہے، اور یہ کہ ممتاز ترین مقام و مرتبے کی حامل ہستی کا وجود آخر کیوں کر معنی خیزی کا تاثر پیش کر سکے؟ اور ایک بار کی ملی ہوئی زندگی آخر کس طرح سب سے بہتر استعمال کے لئے وقف کی جا سکے؟

مراجع

(۱) Iqbal,Muhammad,Doctor,"The reconstruction of religious thought in Islam",Lahore, Sh.Muhammad Ashraf, 1968,P.1

(۲) القرآن۳:۱۸۵

(۳) عبدالنبی، قاضی، ''جامع العلوم''، کراچی، میر محمد کتب خانہ، س ن، ص۱۱۸، ج۲

(۴) القرآن۲:۲۰۸

(۵) القرآن۵:۸

(۶) عثمانی، شبیر احمد، علامہ، ''تفسیر عثمانی''، کراچی، دارالاشاعت، طبع اول۱۹۹۳، ص۳۲۵، ج۱

(۷) الخطیب، محمد بن عبداللہ، ابوعبداللہ، ولی الدین، ''مشکوٰۃ المصابیح''، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۱۴ھ، ص۴۳۲

(۸) ایضاً بحولہ بالا، ص۴۳۳

(۹) ایضاً، ص۴۳۴

(۱۰) ایضاً

(۱۱) ایضاً، ص۴۳۲

(۱۲) ایضاً، ص۴۳۳

(۱۳) ایضاً، ص:۴۳۴

(۱۴) ترمذی، محمد بن عیسیٰ، ابوعیسیٰ، ''جامع الترمذی'' کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۲۵ھ، ص:۲۱، ج۲

(۱۵) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، ''سنن ابی داؤد، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۱۷ھ، ص۳۱۷، ج۲

(۱۶) ''مشکوٰۃ''، بحولہ سابقہ، ص:۴۲۷

(۱۷) ایضاً، ص:۴۳۱

(۱۸) ''جامع الترمذی''، بحولہ سابقہ، ص۲۰، ج۲

(۱۹) القرآن۴۱:۳۴۔۳۵

(۲۰) مشکوۃ، بحولہ سابقہ، ص:۴۳۴

(۲۱) القرآن۴۲:۴۳

(۲۲) القرآن۳۹:۱۰

(۲۳) ''جامع الترمذی''، بحولہ سابقہ، ص۶۶، ج۲